آئین کمیشن کا سوالنامہ

اور

علماء کی طرف سے اس کا متفقہ جواب

حال میں صدرِ مملکت کے مقرر کردہ آئین کمیشن کی طرف سے ۴۰ سوالات پر مشتمل جو سوالنامہ شائع ہوا ہے اس پر غور کرنے کے لیے ۵-۶ مئی ۱۹۶۰ء کو جامعہ اشرفیہ لاہور میں مختلف مکاتب فکر کے نمائندہ علماء کا ایک اجتماع منعقد ہوا اور بالاتفاق ایک جواب تیار کر کے آئین کمیشن کو بھیج دیا گیا۔ اس جواب پر حسب ذیل اصحاب کے دستخط ثبت ہیں:

۱۔ مولانا مفتی محمد حسن صاحب، مہتمم جامعہ اشرفیہ لاہور

۲۔ مولانا مفتی محمد شفیع صاحب، صدر دار العلوم، کراچی

۳۔ مولانا شمس الحق صاحب، صدر وفاق المدارس العربیہ پاکستان، پشاور

۴۔ مولانا محمد ادریس کاندھلوی، شیخ التفسیر والحدیث، جامعہ اشرفیہ، لاہور

۵۔ مولانا ابو الحسنات قادری، امیر حزب الاحناف پاکستان، لاہور

۶۔ مولانا محمد داؤد غزنوی، صدر جمعیت اہلحدیث، لاہور

۷۔ ابو الاعلیٰ مودودی ۸۔ مولانا محمد اسماعیل خطیب جامع اہلحدیث گوجرانوالہ

۹۔ مولانا مفتی محمد حسین نعیمی، مہتمم دار العلوم جامعہ نعیمیہ۔ لاہور

۱۰۔ مولانا سید محمود احمد رضوی، نائب ناظم مرکزی انجمن حزب الاحناف پاکستان، لاہور

۱۱۔ مولانا عطاء اللہ حنیف، خطیب جامع مبارک اہلِ حدیث، لاہور

۱۲۔ مولانا خلیل احمد صاحب قادری، خطیب مسجد وزیر خان، لاہور

۱۳۔ مولانا مفتی سیاح الدین صاحب کاکاخیل، صدر مدرس مدرسہ اشاعت العلوم، لائل پور

۱۴۔ مولانا عبدالحنان صاحب مہتمم دارالعلوم حنفیہ عثمانیہ، راولپنڈی۔

۱۵۔ مولانا محمد حنیف ندوی، لاہور

۱۶۔ مولانا محمد اسحاق، ایڈیٹر الاعتصام، لاہور

۱۷۔ مولانا نصراللہ خان صاحب عزیز، ایڈیٹر تسنیم، لاہور

۱۸۔ میاں طفیل محمد صاحب، مینجنگ ڈائرکٹر اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ، لاہور

۱۹۔ جناب کوثر نیازی صاحب، ایڈیٹر شہاب، لاہور۔

سوال نمبر ۱

آپ کے نزدیک پاکستان میں جمہوری حکومت کے پارلیمانی طریقے کی بتدریج ناکامی کی نوعیت اور اس کے اسباب کیا ہیں جن کی بدولت آخرکار ۱۹۵۶ء کے دستور کی تنسیخ عمل میں آئی؟ (آئندہ اس دستور کا ذکر سابق دستور کے نام سے کیا جائے گا)

جواب:۔ اس سوال کا صحیح جواب دینے کے لیے ناگزیر ہے کہ متعلقہ واقعات کو اُن کی تاریخی ترتیب کے ساتھ دیکھا جائے۔ کیونکہ اس کے بغیر یہ تحقیق ممکن نہیں ہے کہ یہاں دراصل کیا چیز ناکام ہوئی ہے اور اس ناکامی کی نوعیت کیا ہے اور اس کے اسباب کیا ہیں۔

اس سلسلہ میں متعلقہ واقعات کی ترتیب یہ ہے:

(۱) تقسیم سے پہلے برطانوی ہند میں ۱۹۳۵ء کے دستور پر نظامِ حکومت قائم تھا۔ جس کی رو سے حاکمیت کے اصل اختیارات برطانیہ کی پارلیمنٹ کو حاصل تھے، اور برطانوی ہند کے صوبوں کا پارلیمنٹری نظامِ حکومت اِس حاکمیت کے تحت محدود اختیارات پر کام کر رہا تھا۔

(۲) تقسیم کے موقع پر بھارت اور پاکستان کی دو الگ خود مختار مملکتیں وجود میں آئیں۔ مگر حاکمیت براہِ راست ان مملکتوں کے باشندوں کی طرف منتقل نہیں کی گئی بلکہ انڈین انڈی پنڈنس

ایکٹ ۱۹۴۷ء کے تحت اس حاکمیت کو دونوں مملکتوں کی دستور ساز اسمبلیوں کی طرف منتقل کر دیا گیا تاکہ جب تک نیا دستور نہ بنے اُس وقت تک وہ تاج برطانیہ کے جانشین کی حیثیت سے یہاں حاکمیت کے اختیارات استعمال کریں، اور پھر نیا دستور بنا کر ان اختیارات کو باشندوں کی طرف منتقل کر دیں۔ دوسرے الفاظ میں اصل مقصود تو حاکمیت کے اختیارات باشندوں کے حوالہ کرنا تھا، مگر ایک عارضی انتظام کے طور پر یہ اختیارات دستور ساز اسمبلیوں کے پاس بطور امانت رکھے گئے تھے۔

(۳) اس انتظام کے مطابق دونوں ملکوں میں باشندوں کی طرف اختیارات کا منتقل ہونا نئے دستور کے بننے اور اس کے مطابق عام انتخابات منعقد ہونے پر موقوف تھا۔ بھارت کی دستور ساز اسمبلی نے دستور بنانے کا کام نومبر ۱۹۴۹ء میں مکمل کر دیا۔ اس کے بعد جلدی ہی انتخاباتِ عام منعقد کیے گئے اور اختیارات عملاً باشندوں کی طرف منتقل کر دیئے گئے۔ دس سال سے وہاں پارلیمنٹری طرزِ حکومت کے مطابق ہی جمہوریت کا نظام چل رہا ہے۔ اس کی "بتدریج ناکامی" اور "دستور کی تنسیخ" کا وہاں قطعاً کوئی سوال پیدا نہیں ہوا۔ لیکن پاکستان کی داستان اس سے بالکل مختلف ہے

(۴) پاکستان میں شاہی اختیارات کی حامل دستور ساز اسمبلی جن لوگوں کے ہاتھوں میں تھی انہوں نے دستور بنانے اور اختیارات کی امانت قوم کے حوالہ کرنے میں پیہم تاخیر کی۔ اس اسمبلی کے لیے نہ کوئی مدت تھی کہ اُس کے ختم ہونے کے بعد وہ آپ سے آپ ختم ہو جاتی اور نئے سرے سے انتخابات ہوتے۔ نہ اس کو برخاست کرنے کی کوئی آئینی صورت تھی کہ اسے رخصت کر کے لوگوں کو دوسرے آدمی منتخب کرنے کا کوئی موقع ملتا۔ جب تک وہ دستور نہ بناتی، شاہی اختیارات اسے حاصل رہنے تھے۔ اس پوزیشن سے فائدہ اٹھا کر وہ ناقابلِ تغیر و تبدل اسمبلی کئی سال تک دستور بنانے میں تاخیر کرتی رہی۔ اس دوران میں یہ لوگ سرکاری ملازمین (SERVICES) کے بل بوتے پر اپنا اقتدار مضبوط کرنے، اور صوبائی انتخابات جیتنے، اور عوامی مطالبات کو ملازمین (جن سے مراد صرف سول ملازمین ہی نہیں ہیں) کی مدد سے دبانے کی کوشش کرتے رہے، حتیٰ کہ

۱۹۵۲ء تک پہنچتے پہنچتے چھ سال کے اس مسلسل عمل سے ملازمین کے اندر یہ احساس پیدا ہوتا اور بڑھتا چلا گیا کہ طاقت کے اصل مالک وہ ہیں اور یہ سیاسی لیڈر ان کے بل پر حکمرانی کر رہے ہیں۔ اس احساس کو نتیجہ خیز بنانے میں جس چیز نے سب سے بڑھ کر کارگر حصہ لیا وہ یہ تھی کہ مسٹر لیاقت علی خاں مرحوم کی وفات کے بعد رئیس مملکت کا منصب ملازمین ہی کے طبقے کے ایک فرد (مسٹر غلام محمد مرحوم) کو حاصل ہو گیا تھا اور پھر اسی طبقے کے افراد اسی منصب پر فائز ہوتے رہتے۔

(۵) اپریل ۱۹۵۳ء میں، لاہور کے مارشل لا کے دوران، سیاسی لیڈروں سے ملازمین ریاست کی طرف انتقالِ حاکمیت کا پہلا قدم اٹھا، اور وہ گورنر جنرل کی طرف سے دستور ساز اسمبلی کے لیڈر خواجہ ناظم الدین کی برطرفی تھی۔ اس کے معنی یہ تھے کہ عوام کے نمائندہ وزیر اعظم سے تاج برطانیہ کے مقرر کردہ گورنر جنرل نے حکومت کے اختیارات سلب کر لیے۔ اگر برطانیہ میں پاکستان کی حکومت پر دوبارہ قبضہ کر لینے کے لیے کوئی ارادہ موجود ہوتا تو گورنر جنرل کی یہ کارروائی آخر کار تاجِ برطانیہ کی طرف انتقالِ حاکمیت پر منتج ہوتی۔ لیکن چونکہ وہاں ایسا کوئی ارادہ باقی نہ تھا اس لیے یہ عمل ملازمینِ حکومت کی طرف انتقالِ حاکمیت کا پہلا قدم بن گیا۔ لاہور کے مارشل لا نے اُس وقت جو حالات پیدا کر رکھے تھے ان کی وجہ سے باشندگانِ ملک اس پر کوئی احتجاج نہ کر سکے اخبارات نے اپنی خیر منائی اور یہ احساس کیے بغیر اسے سراہا کہ ان کی قوم آزادی سے پھر غلامی کی طرف جا رہی ہے۔ ملازمین نے اس کا خیر مقدم کیا اور ان کے ضمیر نے انہیں یہ احساس نہ دلایا کہ وہ قوم سے تنخواہیں پا رہے ہیں اور قوم ہی کے فراہم کردہ ذرائع و وسائل اور اسلحہ استعمال کر رہے ہیں۔

(۶) اس پہلی ٹھوکر سے دستور ساز اسمبلی کے سیاسی لیڈروں کو یہ خطرہ نظر آ گیا کہ وہ اب تک جن نا شناختہ اختیارات کو قوم کی طرف منتقل ہونے سے روکتے رہے ہیں وہ ان کے ہاتھ میں رہنے کے بجائے ان ملازمین ریاست کی طرف منتقل ہونے لگے ہیں جن کے بل بوتے پر وہ خود حاکمیت کے مالک بن کر رہنا چاہتے تھے۔ اس کے بعد انہوں نے جلدی جلدی دستور بنانا شروع کیا۔ ۱۹۵۴ء کے آخر تک یہ دستور تیار کر دیا گیا اور اس کو آئینی شکل دے دینے کے

لیے ۲۵ دسمبر ۱۹۵۴ء کی تاریخ کا اعلان بھی کر دیا گیا لیکن قبل اس کے کہ اس طرح باشندوں کی طرف انتقالِ اختیارات کی نوبت آتی، ۲۴ اکتوبر ۱۹۵۴ء کو تاجِ برطانیہ کے مقرر کردہ گورنر جنرل نے وہ دستور ساز اسمبلی ہی توڑ دی جس کو تاجِ برطانیہ نے ۱۹۴۷ء میں دراصل اختیاراتِ شاہی بطورِ امانت سپرد کیے تھے۔ اس وقت بھی برطانوی سلطنت میں پاکستان پر دوبارہ قبضہ کرنے کا کوئی ارادہ موجود نہ تھا۔ اس لیے دستور ساز اسمبلی سے چھینی ہوئی یہ حاکمیت ملک غلام محمد صاحب کو کسی ایسی غیر متشخص حیثیت میں حاصل ہو گئی جو نہ تاجِ برطانیہ کے نمائندے کی حیثیت تھی اور نہ باشندگانِ ملک کے نمائندے کی۔ زیادہ سے زیادہ ان کو بس ملازمینِ ریاست کی خواہشات کا نمائندہ کہا جا سکتا ہے، کیونکہ یہ کاروائی وہ اس کے بغیر نہ کر سکتے تھے کہ یہ ملازمین اپنی قوم اور ملک کا حق غصب کرنے میں پوری طرح ان کا ساتھ دیں۔

(۷) اس غصب کو روکنے کے لیے بغاوت کے بجائے عدالت کا راستہ اختیار کیا گیا مگر اس وقت کے فیڈرل کورٹ نے گورنر جنرل کو اس شاہی اختیار (PREROGATIVE) کا حامل قرار دے کر اسے جائز ٹھہرا دیا۔ حالانکہ جیسے انڈین انڈی پنڈنس ایکٹ کے بعد خود اس گورنر جنرل کا تقرر کرنے والا بادشاہ بھی استعمال کرنے کا مجاز نہ رہا تھا، اور نہ اب وہ دوبارہ اسے واپس لیکر استعمال کرنے کے لیے تیار ہی تھا۔ حال ہی میں اس عدالت کے فاضل چیف جسٹس نے خود یہ پوزیشن واضح کر دی ہے کہ فیڈرل کورٹ کا یہ فیصلہ دراصل قانونی نہیں بلکہ سیاسی بنیاد پر تھا، اور اس مجبوری کی بنا پر دیا گیا تھا کہ ملک کی بلند ترین عدالت ان ہاتھوں پر قانون کا فیصلہ نافذ کرنے سے معذور تھی جو اس وقت اختیارات پر قابض ہو چکے تھے (ملاحظہ ہو پاکستان ٹائمز مورخہ ۲۳ اپریل ۱۹۶۰ء میں جسٹس محمد منیر کی تقریر)۔

(۸) اس کے بعد ملک غلام محمد مرحوم نے ایک دستوری کنونشن کے ذریعہ سے ملک کا نیا دستور بنوانے کی کوشش کی۔ اگرچہ چونکہ اس وقت تک خوش قسمتی سے ملک میں اتنی آزادی باقی تھی کہ عدالتیں دستوری مسائل میں کوئی فیصلہ دے سکیں، اس لیے فیڈرل کورٹ نے گورنر جنرل کو احساس

دلایا کہ وہ شاہی اختیار کے حامل ہونے کے باوجود مالک الملک نہیں ہیں کہ جس طرح چاہیں ملک کا دستور بنوا لیں، بلکہ انہیں انڈین انڈی پنڈنس ایکٹ کے حدود میں رہتے ہوئے ایک دستور ساز اسمبلی ہی کے ذریعہ سے، جس کو نمائندہ حیثیت حاصل ہو، ملک کا دستور بنوانا ہوگا۔

(۹) ۱۹۵۵ء کے وسط میں فیڈرل کورٹ کے اس فیصلہ کے مطابق ایک نئی دستور ساز اسمبلی وجود میں آئی جسے کم از کم آئینی طور پر پھر وہی حاکمیت کے اختیارات حاصل ہو گئے جو سابق اسمبلی سے چھینے گئے تھے۔ اس نے مارچ ۵۶ء میں وہ دستور بنا کر نافذ کر دیا جو "سابق دستور" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس دستور کے تحت صدارتِ جمہوریہ کا حلف لینے کے بعد سابق گورنر جنرل اس شاہی اختیار کا حامل نہ رہا جو اسے کسی نہ کسی طرح مل گیا تھا۔ اب وہ پارلیمنٹ کا منتخب کیا ہوا صدر تھا جو اپنے اختیارات دستور اور صرف دستور سے حاصل کر رہا تھا، اور آئین، عقل، انصاف، اخلاق، یا باشندگانِ ملک کی مرضی، غرض کسی ممکن التصور ماخذ سے بھی اس کو یہ حیثیت حاصل نہیں تھی کہ ملک کے آٹھ کروڑ باشندوں میں سے تنہا وہ ملک کی بھلائی کا اجارہ دار بن کر کوئی ایسا فیصلہ کر دے جس کا اختیار اسے دستور نہ دیتا ہو۔ اس طرح کم از کم کاغذی آئین کی حد تک اختیارات کے انتقال کا رُخ ملازمینِ ریاست سے باشندوں کی طرف مُڑ گیا، اور عملاً ان کے منتقل ہونے میں صرف یہ کسر باقی رہ گئی کہ انتخاباتِ عام منعقد ہوں اور باشندگانِ ملک کے نمائندے آ کر ان کی طرف سے اختیارات کی امانت وصول کریں۔ ان انتخابات کے لیے کافی لیت ولعل کے بعد فروری ۱۹۵۹ء کی تاریخیں بھی مقرر ہو چکی تھیں۔

(۱۰) اس آخری مرحلے پر ان سیاسی لیڈروں اور پارٹیوں نے، جن کے ہاتھ میں مرکز اور صوبوں کی حکومتیں تھیں، اس غرض کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے شروع کر دیئے کہ آئندہ انتخابات میں وہی کسی نہ کسی طرح گھوڑے کی پیٹھ پر سوار ہو جائیں، اور اس کام میں انہوں نے پھر ملازمینِ ریاست ہی کو آلۂ کار بنانا چاہا۔ لیکن اب ۱۹۵۳ء سے پہلے کی پوزیشن باقی نہ رہی تھی کہ ملازمین دوسروں کو گھوڑے پر سوار کرنے کا ذریعہ بنتے۔ سیاسی لیڈروں اور پارٹیوں کی کشمکش بالآخر جس چیز

پر ختم ہوئی وہ ۷؍اکتوبر ۵۸ء کو مسٹر سکندر مرزا کے ہاتھوں دستور کی تنسیخ تھی جو انتخاباتِ عام کی تاریخوں کا اعلان ہو چکنے کے تین مہینے بعد عمل میں آئی۔

تاریخی واقعات کے یہ دس مراحل جو ترتیب وار بیان کیے گئے ہیں ان پر غور کرنے سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ قیامِ پاکستان کے بعد یہاں درحقیقت پارلیمنٹری طرز کی جمہوریت سرے سے قائم ہی نہیں ہوئی کہ اس کے ناکام ہونے یا نہ ہونے کا کوئی سوال پیدا ہو۔ پارلیمنٹری جمہوریت صرف وزارتوں کے ذریعہ سے حکومت کرنے کا نام نہیں ہے۔ اس کا اصل جوہر یہ ہے کہ اختیارات کے اصل حامل باشندے ہوں، وہ اپنے نمائندوں کو منتخب کرنے اور بدلنے پر قادر ہوں، اور پھر اس طرح کے نمائندے حکومت کا انتظام چلائیں۔ مگر یہاں برطانوی پارلیمنٹ کے ہاتھ سے نکلے ہوئے اختیارات کی امانت نہ آج تک باشندوں کو منتقل ہوئی، نہ ان اختیارات کو استعمال کرنے کے لیے انہوں نے کبھی اپنے نمائندے منتخب کیے، اور نہ بھارت کے باشندوں کی طرح انہیں اپنی مرضی کی حکومت بنانے اور بدلنے کا کوئی موقع ایک دن کے لیے بھی نصیب ہوا۔ اس کے بجائے یہاں ۱۳ سال سے چند سیاسی لیڈروں اور ملازمینِ ریاست کے درمیان اقتدار کے لیے رسہ کشی ہوتی رہی ہے جس میں آئین و قانون ہی کا نہیں، اخلاق اور دیانت کے بالکل ابتدائی تصورات تک کا ذرہ برابر بھی لحاظ نہیں کیا گیا ہے۔ ملک کے باشندے اس فری اسٹائل کشتی کے دوران میں کبھی اپنے حق کے لیے شور مچاتے اور کبھی بے بسی کے ساتھ اس کا تماشا دیکھتے رہے ہیں۔ اسے خواہ ان باشندوں کی شرافت اور امن پسندی سے تعبیر کیا جاتے، یا کمزوری اور بے شعوری کا نام دیا جائے کہ انہوں نے کبھی اپنا حق وصول کرنے کے لیے بغاوت نہیں کی، نہ خفیہ تحریکوں کا گھناؤنا راستہ اختیار کیا لیکن بہرحال اسے ان کی نااہلی کا نام نہیں دیا جا سکتا، کیونکہ برطانیہ کے ہاتھ سے نکلی ہوئی امانتِ اختیار چند طاقت ور کھلاڑیوں کی فٹ بال بنی رہی ہے، وہ کبھی ان باشندوں کے ہاتھ آئی ہی نہیں کہ وہ اس کا استعمال کرتے اور ان کی اہلیت یا نااہلی کا کوئی اظہار ہو سکتا۔

سوال نمبر ۲

ان اسباب یا ایسے ہی دوسرے اسباب کے پھر رونما ہونے کا سدباب کرنے کے لیے آپ کیا تدابیر تجویز کرتے ہیں؟

جواب: پارلیمنٹری طرزِ حکومت کی نہیں بلکہ خود جمہوریت کی ناکامی کے جو اسباب سوال نمبر ۱ کے جواب میں بیان کیے گئے ہیں ان کو دیکھتے ہوئے ان کے علاج کی جو صورتیں ہماری سمجھ میں آتی ہیں وہ یہ ہیں:

اوّلاً، سیاسی لیڈر اور سرکاری ملازمین، دونوں طبقے خدا کا خوف کریں اور طاقت رکھنے کے باوجود حق شناسی سے کام لیں۔ یہ آزادی جو اگست ۱۹۴۷ء میں ہم کو ملی تھی، یہ دراصل کروڑوں مسلمانوں کی جدوجہد، محنت اور قربانی کا نتیجہ تھی۔ وہ اگر متحدہ جانفشانی نہ دکھاتے اور جان، مال اور آبرو کے ہولناک نقصانات نہ برداشت کرتے تو برطانوی پارلیمنٹ سے حاکمیت کے اختیارات کبھی پاکستان کی طرف منتقل نہ ہوتے۔ اس نتیجے کے حصول میں سرکاری ملازمین اور سیاسی لیڈروں کا حصّہ خواہ کتنے ہی مبالغہ کے ساتھ بیان کیا جائے، بہر حال ان کروڑوں مسلمانوں کی جانفشانی کے مقابلہ میں وہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ پھر حقیقت کے اعتبار سے بھی برطانوی پارلیمنٹ دراصل باشندگان پاکستان کے حق میں حاکمیت سے دست بردار ہوئی تھی نہ کہ چند سیاسی لیڈروں، یا ملازمین ریاست کے حق میں۔ اس امانت کی پوزیشن کو جب تک ٹھیک ٹھیک جان اور مان نہ لیا جائے، اور ایمانداری کے ساتھ اسے ادا کرنے کا مخلصانہ ارادہ پیدا نہ ہو جائے (خواہ اس کی ادائیگی پر مجبور کرنے والی کوئی طاقت خارج میں موجود ہو یا نہ ہو)، اس وقت تک آئندہ کے لیے پاکستان کے دستوری مسئلے کا کوئی اطمینان بخش اور پائیدار حل ممکن نہیں ہے جو اکتوبر ۱۹۵۴ء اور اکتوبر ۱۹۵۸ء کے جھٹکوں کا بار بار اعادہ ہونے سے اس ملک کو بچا سکے۔

ثانیاً، اوپر کی ناگزیر اور مقدم شرط کے متحقق ہو جانے کے بعد عملاً جو اقدام ہونا چاہیے وہ

یہ نہیں ہے کہ ملک کا دستور ایک کمیشن بناتے اور پھر ایک مجلس وزراء اس کو بہ ترمیم یا بلا ترمیم منظور کر کے نافذ کر دے۔ بلکہ صحیح تدبیر یہ ہے کہ ملک میں آزادانہ اور غیر جانبدارانہ طریقہ سے وہی انتخابات عام منعقد کیے جائیں جو فروری ۱۹۵۹ء میں ہونے والے تھے، پھر ملک کے جو نمائندے منتخب ہو کر آئیں انہیں ۱۹۵۶ء کے دستور کے مطابق ہی اختیارات کی وہ امانت سونپ دی جائے جو اگست ۱۹۵۸ء سے اب تک گوئے چوگان بنی رہی ہے، اور انہی پر یہ بات چھوڑ دی جائے کہ دستور میں جس ترمیم کی ضرورت ہو وہ باشندوں کی مرضی کے مطابق کر دیں۔ اگر ایسا نہ ہوا تو اندیشہ ہے کہ جو دستور مارشل لا کی حالت میں ایک کمیشن بنائے گا اور ایک مجلس وزراء اس کی منظوری دے گی وہ اتنا احترام بھی حاصل نہ کر سکے گا جتنا احترام پہلے اس دستور کا ہوا ہے جو کھلے اور آزادانہ بحث مباحثہ کے ماحول میں ایک نمائندہ اسمبلی نے بنایا تھا۔ بار بار دستوروں کا بننا اور اٹھا کر پھینک دیا جانا ملک کے اندر بھی قانون کی حرمت ختم کر دیگا اور ملک کے باہر بھی ہماری عزت اور وقار کا جنازہ نکال دیگا۔

ثالثاً۔ دستور کی تجدید کے بعد تمام ملازمین ریاست سے فرداً فرداً اس امر کا حلف لیا جائے کہ وہ دستور کا احترام کرینگے اور اپنے آپ کو اس کے ماتحت باشندگان ملک کا ملازم سمجھیں گے؛ اور اس کے خلاف، نہ خود کوئی اقدام کریں گے نہ کسی اقدام کرنے والے کا ساتھ دیں گے۔ نیز ان سے یہ بھی حلف لیا جائے کہ ملک میں جو انتخابات بھی ہوں، ان میں وہ قطعاً غیر جانبدار رہیں گے اور کسی پارٹی کے حق میں یا اس کے خلاف، کوئی ایسا کام نہ کریں گے جو دستور و قانون کے منافی ہو۔ دنیا میں کسی جگہ، حتیٰ کہ امریکہ اور انگلستان میں بھی کوئی جمہوری حکومت اس طرح نہیں چل سکتی کہ سرکاری ملازمین ایک سیاسی جتھے کی حیثیت اختیار کریں اور قوم کے نمائندوں کے ماتحت نوکری کرنے کے بجائے، ریاست کا نظام چلانے کی اصل ذمہ داری اپنے ہاتھ میں لے لیں۔

سوال نمبر ۴

۴۔ مذکورہ بالا سوالات کے بارے میں آپ جن نتائج پر پہنچے ہیں ان کی روشنی میں:

(۱) کیا آپ پارلیمانی نظام حکومت کو ترجیح دیتے ہیں یا صدارتی طرز حکومت کو؟

(۲) کیا آپ وحدانی طرز حکومت کے حق میں ہیں یا وفاقی طرز حکومت کے حق میں؟

جواب:۔ (۱) اسلام میں صدارتی طرز حکومت اور پارلیمنٹری طرز حکومت دونوں مباح ہیں اور دونوں کی یکساں گنجائش ہے۔ اب یہ بات کہ ہم کونسا طرز اختیار کریں اس امر پر موقوف ہے کہ ہمارے حالات کے لحاظ سے موزوں تر نظام کونسا ہے۔ اس کا فیصلہ کرنے کے لیے حسب ذیل چند امور قابل توجہ ہیں:

اوّل، اس ملک میں اب تک جمہوریت کا جو نشوونما بھی ہوا ہے، برطانوی طرز پر ہوا ہے اور ہمارے ہاں کے لوگوں کی سیاسی تربیت بھی پارلیمنٹری طرز حکومت ہی کے طریقوں پر ہوتی ہے۔ اس کے برعکس صدارتی طرز حکومت یہاں کے لیے بالکل نیا ہے۔ اگر یہاں کے باشندوں کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ وہ پارلیمنٹری طرز کو جس کا انہیں کچھ نہ کچھ تجربہ ہے نہیں سمجھتے، تو صدارتی طرز ان کے لیے اس سے زیادہ ناقابل فہم ہونا چاہیے جس کا انہیں کوئی تجربہ ہی نہیں ہے۔

دوم، پاکستان کے باشندے اپنے سیاسی ماضی، اپنی تعلیم و تربیت اور اپنی ذہانت و صلاحیت میں بھارت کے باشندوں سے کسی طرح بھی کم تر یا مختلف نہیں ہیں۔ تیرہ سال پہلے تک دونوں ایک ہی نظام حکومت میں رہے ہیں۔ آخر ہم پاکستانیوں کو بھارتیوں کے مقابلہ میں کس لحاظ سے فروتر مانیں کہ بھارتی لوگ تو ایک پارلیمنٹری طرز کے جمہوری نظام کو سمجھ سکتے ہوں اور دس سال سے اس کو چلا بھی رہے ہوں، مگر پاکستانی لوگ اسے سمجھنے اور چلانے کے اہل نہ ہوں، حالانکہ دونوں کا سیاسی تجربہ یکساں اور ایک ہی طرز کا رہا ہے۔

سوم، جیسا کہ ہم سوال ۲ کے جواب میں بتا چکے ہیں، پارلیمنٹری طرز کی جمہوریت کو یہاں بالائی طبقوں کی سازشوں اور کشمکشوں نے ایک دن کے لیے بھی قائم ہونے اور کام

کرنے کا موقع نہیں دیا ہے، پھر کس بنیاد پر یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ یہاں پارلیمنٹری نظام ناکام ہو گیا ہے۔

چہارم: صدارتی طرزِ حکومت سے مراد اگر امریکی طرز کی جمہوریت ہو تو اس حقیقت سے غافل نہ رہنا چاہیے کہ وہ برطانوی طرز کی پارلیمنٹری جمہوریت سے بہت زیادہ پیچیدہ ہے۔ اس کو چلانے کے لیے بہت زیادہ سیاسی شعور اور سیاسی تربیت کی ضرورت ہے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اسے واقعی جمہوریت کے راستہ پر قائم رکھنے کے لیے باشندوں میں بھی اور سرکاری ملازمین میں بھی اتنا شعور، اتنا عزم اور اتنی اخلاقی حس درکار ہے کہ اگر صدارت کسی وقت بھی جمہوری راستہ سے ہٹ کر بادشاہی کا راستہ اختیار کرنے لگے تو پبلک اور کانگریس اور عدلیہ اور سول سروس، اور فوج اور بحریہ اور فضائیہ سب مل کر اس کو چند گھنٹوں کے اندر راہِ راست پر لے آئیں۔ جہاں یہ صورت نہ ہو وہاں صدارتی طرزِ حکومت کے معنی یہ ہیں کہ جب کبھی ایوانِ نمائندگان کوئی ایسا قانون بنائے جو صدارتی حکومت کو پسند نہ ہو اور صدر کے زور دینے پر بھی وہ اسے تبدیل نہ کرے، یا جب کبھی یہ ایوان صدر کی حکومت کا مطالبۂ زر اس کی مرضی کے مطابق منظور نہ کرے تو پولیس اور فوج اس ایوان پر چڑھ دوڑے اور یا تو بزور اسے حکمِ حضورؐ کی تعمیل کرتی ہو، یا پھر سرے سے ایوان ہی توڑ دیا جائے۔ دو مرتبہ یہ ڈراما ہمارے ہاں ہو چکا ہے۔ اب اس ملک کو ایسے ڈراموں کی مستقل تماشا گاہ تو نہ بنا دینا چاہیے۔

(۲) اس شق کے سوال کا جواب یہ ہے کہ ۱۹۵۶ء کے دستور میں آزادانہ مباحثہ کے بعد ملک کے مختلف حصوں کے نمائندوں اور باشندوں کی مرضی سے وفاقی طرز اختیار کیا گیا تھا، اس لیے سرِدست اسی پر عمل ہونا چاہیے۔ اس میں اگر کسی تبدیلی کی ضرورت بھی ہو تو اس کا فیصلہ ملک کے نمائندوں ہی پر چھوڑ دیا جانا چاہیے۔

سوال نمبر ۴

اگر آپ پارلیمانی طرزِ حکومت کی سفارش کرتے ہیں تو پھر ان تدابیر کی نشاندہی کریں

جن کو کام میں لانے سے ایک طرف تو حکومت کو پائیداری اور قرار نصیب ہو اور دوسری طرف پارٹیوں کی خاطر حکومت کے نظم ونسق میں جو روزمرہ بے جا دخل اندازی ہوتی ہے اس کی مؤثر طریق سے روک تھام کی جا سکے۔

جواب ۔ اس سوال کے جواب میں ہم سوال ۱ و ۱۲ کے جوابات کی طرف بالعموم اور سوال ۱۲ کے جواب کی تیسری شق کی طرف بالخصوص کمیشن کی توجہ مبذول کراتے ہیں۔ اگر انتخابات میں سرکاری ملازمین کی مداخلت کو روک دیا جائے، اور منصفانہ انتخابی قوانین کو ایمانداری اور غیر جانبداری کے ساتھ ٹھیک ٹھیک نافذ کیا جاتے تو ان بددیانت سیاسی کھلاڑیوں کے برسرِ اقتدار آنے کا بہت کم موقع باقی رہ جاتا ہے جو ناجائز اغراض کے لیے نظم ونسق میں مداخلت بے جا کرتے ہیں، اور اپنی سیاسی اکھیڑ پچھاڑ سے ملک میں بحران پیدا کرتے رہتے ہیں۔ تاہم ایک دو مرتبہ کے انتخاباتِ عام میں عوام کچھ نہ کچھ غلطیاں ضرور کریں گے جن سے نامناسب آدمیوں کو بھی اوپر آنے کے راستے مل جائیں گے۔ لیکن اگر صبر کے ساتھ عوام ہی کو تجربات سے سبق سیکھ سیکھ کر جمہوری نظام چلانے کا موقع نصیب ہو تو پاکستان بھی چند سال کے اندر کم از کم اتنی ہی کامیابی سے یہ نظام چلا سکے گا جس کا مشاہدہ ہم اپنے ساتھ کے آزاد ہونے والے ملکوں (بھارت، برما اور سیلون) میں کر رہے ہیں۔ ایک نوجوان اپنی جائداد کا انتظام سنبھالتے ہی تجربہ کار نہیں ہو جاتا۔ ٹھوکریں کھا کھا کر ہی وہ انتظامی تجربہ حاصل کرتا ہے۔ لیکن اگر وہ دائماً کسی سرپرست کے زیر سایہ رہے اور کبھی بااختیار خود کام کرنے کا موقع نہ پائے تو عمر بھر وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے قابل نہیں ہو سکتا۔ اس ملک میں جمہوری حکومت کی پائیداری (STABILITY) کے لیے دراصل تین چیزوں کی ضرورت ہے: ایک، آزادانہ و غیر جانبدارانہ انتخابات۔ دوسرے، جمہوریت کو تجربات کی مدد سے نشوونما کا آزادانہ موقع حاصل ہونا۔ تیسرے، ملازمین ریاست کا اس بات کو ٹھیک ٹھیک سمجھ لینا کہ نہ تو ان کی قوم نابالغ یتیم کی حیثیت رکھتی ہے اور نہ وہ اس کے ولی مقرر کیے گئے ہیں۔

سوال نمبر ۵

چونکہ صدارتی طرزِ حکومت میں اختیارات منقسم ہوتے ہیں اور اس تقسیمِ اختیارات کی وجہ سے انتظامیہ اور مقننہ ایک دوسرے سے آزاد رہ کر کام کرتی ہیں، اس لیے ایک ایسا طریقِ کار اختیار کرنا ضروری ہے جس سے حکومت کے مختلف شعبوں کے درمیان موافقت پیدا ہو اور تعطل رونما نہ ہونے پائے۔ اگر آپ صدارتی طرزِ حکومت پسند کرتے ہیں تو پھر کیا آپ کے نزدیک روک تھام اور توازن کا وہی نظام جو امریکی دستور میں قائم کیا گیا ہے ہماری ضروریات کو بھی پورا کرنے کے لیے کافی ہے، خصوصاً مطالبات زر، خارجی تعلقات، اور وزراء و سفراء اور انتظامیہ اور فوج کے اونچے عہدیداروں کے تقرر کے معاملے میں؟ یا آپ اس میں کسی قسم کی ترمیم کے خواہاں ہیں؟

جواب۔ اس کا جواب سوال ۳ کے جواب میں آگیا ہے۔

سوال نمبر ۶

اگر آپ وحدانی طرزِ حکومت کے حق میں ہیں تو براہِ کرم ان تبدیلیوں کی نشاندہی کریں جو آپ کے نزدیک موجودہ انتظامی ڈھانچے میں کرنی ہونگی۔

جواب۔ اس کا جواب سوال ۳ کی شق (۲) میں دیا جاچکا ہے۔

سوال نمبر ۷

اگر آپ وفاقی طرزِ حکومت کو ترجیح دیتے ہیں تو بتائیے کہ

(ا) وفاق بنانے والی وحدتیں کون کون سی ہونی چاہییں؟

(ب) ان وحدتوں (یعنی صوبوں) میں سے ہر ایک کے لیے آپ کس طرز کی حکومت تجویز کرتے ہیں؟

(ج) آپ مرکز اور وحدتوں کے درمیان قانون سازی کے اختیارات کس طرح تقسیم کریں گے؟

(د) آپ وفاقی دارالحکومت کے انتظام کی کیا صورت تجویز کرتے ہیں؟

جواب - اس کی شق، ا، ب اور ج کا جواب یہ ہے کہ ۱۹۵۶ء کے دستور کے مطابق عمل ہونا چاہیے۔

شق (د) کا جواب یہ ہے کہ اس چیز کو ایک نمائندہ ایوان ہی اطمینان بخش طریقے پر طے کر سکتا ہے۔

سوالات نمبر ۸، ۹، ۱۰، ۱۱

۸ - کیا آپ اس سے متفق ہیں کہ صدر کو قانون سازی کے اختیارات بھی حاصل ہوں؟ اگر اتفاق ہے تو آپ کے نزدیک ان اختیارات کو وہ کن حالات میں استعمال کرے؟

۹ - صدر کا انتخاب کس طریقے سے ہونا چاہیے؟ کیا آپ یہ سفارش کرتے ہیں کہ انتخاب

(الف) بالغ رائے دہندگی کے اصول پر ہو؟

(ب) یا محدود بالغ رائے دہندگی کے اصول پر، مثلاً اس شرط کے ساتھ کہ وہ خواندہ ہو، یا ایک خاص حد تک جائداد کا مالک ہو؟

(ج) یا ایک انتخابی ادارے کے ذریعہ سے؟

(د) اگر آپ (ب) کے حق میں ہیں تو پھر رائے دہندگی کو آپ کن حدود سے محدود کریں گے؟

(س) اگر آپ (ج) کو ترجیح دیتے ہیں تو کیا پھر آپ اُسی انتخابی ادارے کے قیام کی سفارش کرتے ہیں جس کے ذریعہ سے حال ہی میں صدر کا انتخاب ہوا ہے (یعنی بنیادی جمہوریتوں کے حکم مجریہ ۱۹۵۹ء کے تحت لوکل کونسلوں کے منتخب ارکان)؟ اگر آپ اس امر کے حق میں نہیں ہیں تو پھر آپ کون سا انتخابی ادارہ

تجویز فرماتے ہیں۔

۱۰۔ ضمیمہ (د) میں وہ ساری دفعات درج ہیں جو سابق دستور میں صدر کے اوصاف، عہدے کی میعاد اور علیحدگی کے متعلق رکھی گئی تھیں۔ کیا آپ اس بات کے حق میں ہیں کہ انہی کو من و عن اختیار کر لیا جائے یا آپ ان میں کسی ترمیم کے خواہاں ہیں۔ اگر آپ صدارتی طرزِ حکومت کے حق میں ہیں تو کیا آپ اس بات کی سفارش کرتے ہیں کہ ایک نائب صدر بھی ہو؟ اسے کس طرح منتخب کیا جائے اور اس کے فرائض اور اختیارات کیا ہونے چاہییں؟

۱۱۔ کیا آپ یک ایوانی مجلسِ قانون ساز کے حق میں ہیں یا دو ایوانی کے حق میں؟ ارکان کی تعداد کیا ہونی چاہیے اور آپ اسے کس طرح معین کریں گے؟

جواب ۔ ان چار (۴) سوالات کا جواب یہ ہے کہ ۱۹۵۶ء کے دستور کے مطابق عمل ہونا چاہیے۔

سوال نمبر ۱۲

۔ مجلسِ قانون ساز کے ارکان کا انتخاب کس طرح کیا جائے؟

(۱) کیا آپ اس امر کی سفارش کرتے ہیں کہ انتخاب:

(الف) بالغ رائے دہندگی کے اصول پر ہو۔

(ب) یا محدود بالغ رائے دہندگی کے اصول پر، مثلاً یہ کہ ووٹر خواندہ ہو، یا کسی خاص حد تک جائداد رکھتا ہو؟

(ج) یا ایک انتخابی ادارے کے ذریعہ سے؟

(۲) اگر آپ (ب) کے حق میں ہیں تو پھر رائے دہندگی کو کن حدود سے محدود کیا جائے؟

(۳) اگر آپ (ج) کو ترجیح دیتے ہیں تو کیا پھر آپ اُس انتخابی ادارے کے قیام کی سفارش کریں گے جس کے ذریعہ حال ہی میں صدر کا انتخاب ہوا ہے؟

اگر آپ اس کے حق میں نہیں ہیں تو پھر آپ کونسا انتخابی ادارہ تجویز کرتے ہیں۔

جواب ۔ ہمارے نزدیک انتخاب کی تمام ممکن صورتوں میں نسبتۃً بہتر اور قباحتوں کے لحاظ سے کم تر صورت یہ ہے کہ:

——— ہر بالغ کو حق رائے دہی دیا جائے، کیونکہ اولاً، محدود حق رائے دہی کی جتنی صورتیں بھی ہیں ان میں ناجائز تدابیر کی کامیابی کے مواقع حق رائے دہندگی بالغان کی بہ نسبت زیادہ ہوتے ہیں۔ ثانیاً، ہم اپنے عوام کو سیاسی تربیت دیکر ملک کی آزادی کی جڑیں اسی طرح مستحکم کرسکتے ہیں کہ عوام پر سیاسی نظام چلانے کی ذمہ داری کا بار ڈالا جائے اور وہ انتخابات میں مختلف جماعتوں کے منشور اور اشخاص کو جانچنے اور ان میں سے بہتر کو چھانٹنے کے لائق بنیں۔ ثالثاً، محدود حق رائے دہی کی صورت میں ووٹروں کے اندر خود غرض عناصر کا تناسب بہت زیادہ ہوجاتا ہے، اس کے برعکس عام حق رائے دہی میں ان کی نسبت گھٹ جاتی ہے۔ عام باشندے خود اپنے دشمن نہیں ہوتے کہ جان بوجھ کر بُرے لوگوں کو اپنے اوپر مسلط کرلیں۔

——— بالواسطہ انتخاب۔ یا الکٹورل کالج کا طریقہ ہمارے ملک کے حالات میں بدترین ممکن طریق انتخاب ہے، کیونکہ ووٹروں کی محدود تعداد کو مختلف قسم کی رشوتوں سے خریدنا، تعلقات سے متاثر کرنا، اور دباؤ ڈال کر مغلوب کرنا زیادہ آسان ہوتا ہے، بہ نسبت اس کے کہ کوئی امیدوار ایک بڑے حلقۂ انتخاب کے ہزار ہا عام ووٹروں کو خرید سکے یا دبا سکے یا ان پر تعلقات کا اثر ڈال سکے۔

سوال نمبر ۱۳

۱۳- یہ سوال کہ انتخابات مخلوط رائے دہندگی کے اصول پر ہوں یا جداگانہ رائے دہندگی کے اصول پر، سابق آئین میں پارلیمان کے فیصلے پر چھوڑ دیا گیا تھا۔ آخر کار اس امر کا فیصلہ مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں کی قراردادوں سے ہوا اور مخلوط رائے دہندگی کو اپنا لیا گیا۔ کیا آپ اسی فیصلے کے حق میں ہیں یا اس سلسلہ میں کوئی اور تجویز پیش کرنا چاہتے ہیں؟

جواب ۔ہمیں تعجب ہے کہ سابق پارلیمنٹ کے فیصلوں میں سے صرف طریقِ انتخاب ہی کا فیصلہ محترم کمیشن کو قابلِ لحاظ محسوس ہُوا، حالانکہ یہی سب سے زیادہ قابلِ اعتراض تھا اور اُس پارلیمنٹ نے اسے سیاسی پارٹیوں کی سازشوں اور سودے بازیوں کے بدترین دور میں سخت شرمناک ہتھکنڈوں سے پاس کیا تھا۔ درحقیقت یہ طریقِ انتخاب پاکستان کے بنیادی نظریہ سے ٹکراتا ہے اور اس ملک کے لیے مہلک زہر کا حکم رکھتا ہے۔ اگر کمیشن ضرورت محسوس کرے تو ہم اس کے نقصانات کے متعلق پورا مواد فراہم کرنے کے لیے تیار ہیں۔ ہماری رائے یہ ہے کہ اس قانون کے بجائے سابق طریقِ کار کے مطابق ملک کے پہلے انتخاباتِ عام منعقد کیے جائیں، پھر طریقِ انتخاب کا آخری فیصلہ عوام کے نمائندے خود کریں۔

سوالات نمبر ۱۴ تا ۲۱

۱۴ مجلس قانون ساز کی رکنیت کے لیے کیا شرائط ہونی چاہئیں؟ اگر آپ دو ایوانی مجلس قانون ساز کے حق میں ہیں تو پھر آپ کے نزدیک ایوانِ بالا کی ہیئت ترکیبی کیا ہونی چاہیے؟

(الف) کیا یہ انتخاب پیشہ وارانہ نمائندگی کے اصول پر کیا جائے جس میں اس بات کا بھی انتظام ہو کہ علم و تجربہ رکھنے والے ممتاز افراد نامزد کیے جا سکیں؟

(ب) یا یہ ایوان بھی ایوانِ زیریں کی طرح پورے کا پورا منتخب ہو اور اس کے امیدواروں کے اوصاف ایوان زیریں کے ارکان کے اوصاف سے بلند تر رکھے جائیں۔

۱۵ ۔ آپ کی رائے میں دونوں ایوانوں کے (الف) متعلقہ اختیارات اور ان کی مدت، (ب) ان کے باہمی تعلقات (ج) صدر کے ساتھ ان کے تعلقات کی نوعیت کیا ہونی چاہیے؟

۱۶ ۔ اگر آپ وفاقی طرزِ حکومت کے حق میں ہیں تو پھر کیا آپ وفاقی وحدتوں

یعنی صوبوں کے لیے یک ایوانی مجلس قانون ساز تجویز کرتے ہیں یا دو ایوانی ؟

۱۷۔ اگر آپ صوبوں کے لیے دو ایوانی مجلس قانون ساز کے حق میں ہیں تو پھر (الف) دونوں ایوانوں کے جدا جدا اختیارات اور ان کی مدت قیام (ب) ان کے باہمی تعلقات، (ج) اور صوبے کے سربراہ یعنی گورنر کے ساتھ ان کے تعلقات کی نوعیت کیا ہونی چاہیے ؟

۱۸۔ اگر آپ یک ایوانی مجلس قانون ساز کے حق میں ہیں تو پھر بتائیں کہ صوبائی مجلس قانون ساز کے گورنر کے ساتھ کیا تعلقات ہونے چاہییں ؟

۱۹۔ کیا آپ اس امر کے حق میں ہیں کہ گورنر کو قانون سازی کے اختیارات حاصل ہوں، اگر ایسا ہے تو پھر بتائیں کہ وہ انہیں کن حالات کے تحت استعمال کرے ؟

۲۰۔ سابق آئین کی دفعہ ۷۰ میں گورنر کے اوصاف، استعفے کے طریق کار اور عہدے کی میعاد وغیرہ امور کے بارے میں جو صورتیں رکھی گئی تھیں، کیا آپ انہی کو اختیار کریں گے یا ان میں تبدیلی ضروری سمجھتے ہیں ؟

۲۱۔ سابق آئین کی دفعہ ۲۱۳ میں گورنر کو جو تحفظ دیا گیا تھا آپ اسی کے حق میں ہیں ؟ اگر حکومت وحدانی ہو تو کیا آپ پھر بھی اسے اسی قسم کا تحفظ دینے کی سفارش کرتے ہیں ؟

جواب ۔ ان سب معاملات میں سابق دستور کے مطابق عمل ہونا چاہیے ۔

سوال نمبر ۲۲

کیا آپ یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ نئے دستور میں بنیادی انسانی حقوق اسی طرح صراحت کے ساتھ مقرر کیے جائیں جس طرح سابق آئین میں کیے گئے تھے ؟ یا آپ کا یہ خیال ہے کہ برطانیہ کی طرح اطمینان کے ساتھ ان حقوق کے تحفظ کا کام مجلس قانون ساز کی نیک نیتی اور عدلیہ کی دانشمندی و تجربہ کاری پر چھوڑ دیا جائے

اور یہ یقین کر لیا جائے کہ عدالتیں معروف و مسلّم اصولوں پر خود عمل کروائیں گی؟

جواب - سابق دستور میں باشندوں کو جو بنیادی حقوق عطا کیے گئے تھے ان کو جوں کا توں باقی رہنا چاہیے۔ سردست ان میں کوئی ردّو بدل برداشت نہیں کیا جا سکتا۔

سوال نمبر ۲۳

کیا آپ نئے آئین میں مستقبل کی مجالس قانون ساز اور حکومت کی رہنمائی کے لیے وہی دیباچہ اور رہنما اصول برقرار رکھنا ضروری سمجھتے ہیں جو سابق آئین میں موجود تھے؟

جواب - سابق دستور کا دیباچہ اور رہنما اصول نہایت ضروری ہیں، اس میں بھی کوئی تبدیلی قابلِ قبول نہیں ہے۔

سوالات نمبر ۲۴، ۲۵، ۲۶

۲۴- سابق آئین میں سپریم کورٹ اور عدالت ہائے عالیہ کے دائرۂ اختیار اور ان عدالتوں کے ججوں کے اوصاف، مدت، تقرر اور برطرفی سے متعلق جو دفعات تھیں، کیا آپ انہی کو اختیار کر لینے کے حق میں ہیں یا ان میں کوئی ترمیم ضروری سمجھتے ہیں؟

۲۵- کیا آپ اٹارنی جنرل اور ایڈووکیٹ جنرل سے متعلق سابق آئین کی دفعات کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں یا اس بارے میں کچھ اور تجاویز پیش کرتے ہیں؟

۲۶- سابق دستور کی دفعات ۱۷۹ تا ۱۸۳ سرکاری ملازمین کی شرائطِ ملازمت، میعاد، عہدہ، بھرتی اور نظم و ضبط وغیرہ امور سے بحث کرتی ہیں۔ کیا آپ انہی کو مناسب سمجھتے ہیں یا ان میں کسی ترمیم اور تبدیلی کے خواہاں ہیں۔ اگر آپ تبدیلی کے حق میں ہیں تو براہِ کرم مطلوبہ تبدیلیوں کی نشاندہی کریں۔

جواب:- ان امور میں بھی سابق دستور ہی کے مطابق عمل ہونا چاہیے۔

سوال نمبر ۲۷

فرانس میں ایک جامع نظام موجود ہے جسے انتظامی قانون کے نام سے

موسوم کیا جاتا ہے۔ یہ قانون (الف) خود اپنے ملازمین کے ساتھ حکومت کے تعلق دربابِ نظم و ضبط وغیرہ، کو، اور (ب) سرکاری فرائض کی انجام دہی کے دوران میں پبلک کے ساتھ سرکاری ملازمین کے برتاؤ کو ضابطے اور قاعدے میں لاتا ہے۔ اس کے لیے وہاں انتظامی عدالتیں قائم ہیں جن کے اوپر سب سے بڑی انتظامی عدالت ہے جو کونسل آف سٹیٹ کہلاتی ہے۔ یہ کونسل زندگی کے تمام شعبوں سے تعلق رکھنے والے ممتاز افراد پر مشتمل ہوتی ہے اور مذکورہ بالا امور میں فیصلے کی آخری عدالت کے فرائض انجام دینے کے علاوہ بہت سے اہم معاملات میں حکومت کے مشیر کی حیثیت سے بھی کام کرتی ہے۔ فرانس میں یہ نظام نہایت تسلی بخش سمجھا جاتا ہے۔ کیا آپ کے نزدیک اس نظام کو کچھ ردّ و بدل کے ساتھ اس ملک میں رائج کر دینا فائدہ مند ثابت ہوگا؟

جواب ۔ فرانسیسی قانون کے اس طریقے کو پاکستان میں اختیار کرنے سے ہمیں اختلاف ہے۔ اسلامی تصورِ انصاف ہمیشہ سے یہ رہا ہے کہ ایک ہی قانون اور ایک ہی عدالت حکام کے لیے بھی اور رعیت کے لیے بھی۔ اتفاق کی بات ہے کہ اسی اسلامی تصور کو اس اینگلو سیکسن نظامِ قانون میں بھی اختیار کیا گیا تھا جس کے تحت ہم انگریزوں کی غلامی کے دور میں زندگی بسر کرتے رہے۔ اب یہ نیا تصور، جس سے ہمارے ہاں کے لوگ بالکل ناآشنا ہیں، فرانس سے درآمد کرنے کی کیا حاجت ہے، خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ ہم سات سال سے مسلسل ملازمینِ ریاست کی آقائی کے خطرے میں مبتلا ہیں۔ فرانس کا یہ نیا نظامِ قانون اختیار کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ سرکاری ملازمین کا ایک "فرمانروا طبقہ" (RULING CLASS) اس قانون کے زیرِ سایہ پروان چڑھے گا جس کا قانونی مرتبہ عوام سے بلند قرار پائے گا۔

سوالات نمبر ۲۸ تا ۳۲

۲۸۔ سابق آئین میں پبلک سروس کمیشن سے متعلق جو دفعات تھیں، کیا آپ

انہی کو اختیار کرنے کی سفارش کرتے ہیں یا کسی تبدیلی کی ضرورت محسوس کرتے ہیں؟

۲۹۔ کیا تمام مدارج کے انتخابات کا انتظام پاکستان انتخابی کمیشن کے سپرد کیا جاتا ہے؟ اور کیا اسی کو ان تمام تدابیر پر عملدرآمد کرنے کا ذمہ دار قرار دیا جائے جو عام اور ضمنی انتخابات کے لیے تیاری کرنے اور ان کا انتظام کرنے کے لیے ضروری ہیں؟

۳۰۔ کیا انتخابی فہرستوں کی تیاری اور ان پر نظر ثانی کرنے کا کام انتخابی کمیشن انجام دے؟ کیا یہ ضروری ہے کہ بنیادی جمہوریتوں کے انتخاب کے لیے فہرستیں تیار کرنا اور پھر انتخابات کرانا انتخابی کمیشن کی نگرانی میں ہو یا یہ فرائض انتظامیہ کو سونپے جائیں؟

۳۱۔ کیا چیف الیکشن کمشنر اور انتخابی کمشنروں کا تقرر صدر ریاست اپنی صوابدید سے کرے یا اس تقرر کے لیے مقننہ کی منظوری بھی لازمی سمجھی جاتی ہے؟ یا آپ انتخابی کمیشن کی آزادی برقرار رکھنے کے لیے اس کے تقرر کا کوئی اور طریقہ تجویز کرتے ہیں۔ یا آئین میں اس کے لیے کچھ اور دفعات رکھوانا چاہتے ہیں؟

۳۲۔ سابق آئین کی دفعہ ۱۴۲ حد بندی کمیشن سے بحث کرتی ہے۔ اس میں جو کچھ لکھا گیا ہے کیا آپ اسی کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں یا کسی تبدیلی کی سفارش کرتے ہیں؟

جواب۔ ان تمام امور میں سابق دستور کے مطابق عمل ہونا چاہیے۔

سوال نمبر ۳۳

۳۳۔ سابق دستور کی جو دفعات اُن اقدامات سے بحث کرتی ہیں جو دورانِ جنگ یا داخلی اضطرابات کی حالت میں کیے جاتے ہیں، کیا آپ انہی کو کافی سمجھتے ہیں یا ان میں کوئی تبدیلی کرنا چاہتے ہیں؟

جواب۔ اگرچہ ہم سابق دستور کی دفعات ۱۹۲ اور ۱۹۶ کو قابلِ اعتراض سمجھتے ہیں اور ان کی اصلاح ہمارے نزدیک ضروری ہے۔ مگر سرِدست ہماری رائے یہی ہے کہ سابق دستور جوں کا توں بحال کیا جاتے اور اس کی ترمیم و اصلاح کے کام کو عوام کی نمائندہ اسمبلی پر چھوڑا جائے

سوال نمبر ۳۴

کیا آپ نئے دستور میں ایسی کچھ دفعات رکھنا ضروری خیال کرتے ہیں کہ مسلمانوں کو اسلام کی بنیادی اقدار اور زندگی کے تغیر پذیر حالات پر ان کے انطباق کا مطالعہ کرنے میں مدد دی جاتے؟ اگر ایسا ہے تو آپ اس کے لیے کیا خاص تدابیر تجویز کرتے ہیں؟

جواب ۔ ہمیں سخت افسوس ہے کہ یہ سوال ہمارے سامنے اس شکل میں رکھا گیا ہے کہ کیا تم مسلمانوں کو اسلام کی بنیادی قدروں کے مطالعہ میں مدد دینے کے لیے نئے دستور کے اندر کسی دفعہ کا شامل کیا جانا ضروری سمجھتے ہو؟ اس صورتِ سوال سے اس طرزِ فکر کی کوئی اچھی تصویر آدمی کے سامنے نہیں آتی جس کے ساتھ یہ مسئلہ کمیشن کی توجہ کا مستحق بنا ہے۔ ہم اپنا فرض ادا کرنے میں سخت کوتاہی برتیں گے اگر اس کام کے مرحلۂ آغاز ہی میں کمیشن کو، اور آگے اُن اربابِ اقتدار کو جن کے ہاتھ میں کمیشن کی رپورٹ پر فیصلہ صادر کرنے کا اختیار ہے، دو باتوں سے صاف صاف آگاہ نہ کر دیں:

اوّل، یہ کہ پاکستان عام مسلمانوں کی قربانیوں سے بنا ہے اور خدا کے فضل و کرم کے بعد دوسری کوئی چیز اگر اس کے بقا و استحکام کی ضامن ہے تو وہ عام مسلمانوں کا یہ عزم ہے کہ اس مملکت کو باقی رکھا جاتے۔ کوئی غیر مسلم اس مملکت کو وجود میں نہیں لایا ہے۔ نہ مسلمانوں کی قربانیوں کے بغیر یہ بن سکتا تھا۔ اور نہ یہ باقی رہ سکتا ہے اگر خدانخواستہ عام مسلمان اس سے مایوس ہو جائیں اور ان کے اندر اس کو زندہ رکھنے کے لیے کٹنے اور مرنے کا جذبہ باقی نہ رہے۔

دوم، یہ کہ چند اونچے درجے کے سرکاری ملازمین اور چند خوشحال طبقات کے سوا عام مسلمان اس ملک کو ایک اسلامی ریاست دیکھنا چاہتے ہیں جس کا قانون اسلامی ہو، جس کا نظام اسلامی ہو، جس کی تعلیم اسلامی ہو، اور جس کی تہذیب اسلامی ہو۔ اسی مقصد کے لیے مسلمانوں نے قیامِ پاکستان کے لیے جان و مال اور آبرو کی قربانیاں دیں۔ اسی کے لیے ان کو قیامِ پاکستان سے دلچسپی تھی اور

اسی کے لیے وہ لگاتے پاکستان سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ اس دلچسپی کو ختم کر دینے سے بڑھ کر پاکستان کے ساتھ کوئی اور دشمنی نہیں ہو سکتی۔ عام مسلمانوں کو مایوس اور بددل کر دینے کے بعد وہ مٹھی بھر لوگ اس مملکت کو کیا سہارا دے سکتے ہیں جو اسلام کے نام سے گھبراتے ہیں۔

ان دو حقیقتوں کو خوب سمجھ لینے کے بعد یہ فیصلہ کیجیے کہ آپ جو دستور بنانا چاہتے ہیں اس میں کس کو مطمئن کرنا آپ کے نزدیک زیادہ اہمیت رکھتا ہے؟ اگر آپ اس ملک کی ۸۵ فی صدی مسلم آبادی کے اطمینان کو کوئی اہمیت دیتے ہیں تو پھر آپ کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ مسلمان اس مملکت سے صرف اتنی سی بات نہیں چاہتے کہ انہیں اس سے بس اپنے دین کی قدروں کے مطالعہ میں مدد مل جائے۔ ان قدروں کا تو وہ قیام پاکستان سے پہلے بھی مطالعہ کرتے رہے ہیں اور اب بھی انشاءاللہ کرتے رہیں گے صرف اتنے سے کام کے لیے انہیں لڑ بھڑ کر ایک نئی مملکت بنوانے کی کوئی حاجت نہ تھی۔ وہ جس چیز کے خواہاں ہیں وہ اس پوری مملکت کو ایک اسلامی ریاست بنانا ہے۔ اور اس غرض کے لیے ان کو کم سے کم جو چیز مطمئن کر سکتی ہے جس سے کم پر وہ ہرگز راضی نہیں ہیں، وہ یہ ہے کہ سابق دستور کی دفعات ۲۴ تا ۲۶، ۲۸ تا ۳۰، ۲۰۴(۲)، ۱۹۷، اور ۱۹۸ کو علیٰ حالہا باقی رکھا جائے۔ اگرچہ اسلامی نقطہ نظر سے یہ دفعات بھی ناقص اور ناکافی ہیں، اور ان سے زائد بہت کچھ ضروری ہے لیکن جو کچھ پہلے مانا جا چکا ہے اس سے پیچھے جانے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔

سوالات نمبر ۳۵ تا ۳۷

۳۵۔ سابق آئین میں یوم آئین کے بعد سے دس سال تک قومی اسمبلی اور صوبائی اسمبلی میں خواتین کے لیے نشستیں مخصوص کی گئی تھیں۔ کیا آپ اس قسم کی تخصیص کو ضروری سمجھتے ہیں؟

۳۶۔ آپ اچھوتوں اور پس ماندہ طبقات کے لیے کون سی خصوصی دفعات تجویز کرتے ہیں؟

۳۷۔ سابق دستور میں مستثنیٰ اور مخصوص علاقوں کے لیے جو دفعات رکھی گئی تھیں کیا آپ ان میں کسی تبدیلی کی سفارش کرتے ہیں؟

جواب۔ ان کا جواب یہ ہے کہ سابق دستور ہی کے مطابق عمل کیا جائے۔

سوال نمبر ۳۸

۳۸- دستور میں ترمیم کے لیے آپ کیا صورتیں تجویز کرتے ہیں ؟ کیا آپ سادہ اکثریتی ووٹ کے ذریعہ یا اس سے بڑے مثلاً دو تہائی یا تین چوتھائی اکثریت کے ذریعہ ترمیم پسند کریں گے؟

جواب - اگر سابق دستور بحال ہو تو اس کی دفعہ ۲۱۶ دربابِ ترمیم دستور برقرار رہنی چاہیے لیکن اگر اب کوئی نیا دستور بنایا جائے تو ہم اس کی ترمیم کے لیے مجرّد حاضر ارکان کی اکثریت کے ووٹ کا طریقہ اختیار کرنے کو ترجیح دیں گے۔

سوال نمبر ۳۹

۳۹- ایک ایسی جمہوریت کے قیام کے لیے جو تغیر پذیر حالات کے ساتھ مطابقت پیدا کرتی جائے اور جو انصاف، مساوات اور رواداری کے اسلامی اصولوں پر مبنی ہو آپ دوسری کیا تجاویز پیش کریں گے؟

جواب - اس سوال کے جواب میں ہم کمیشن کو اسلامی مملکت کے ان ۲۲ بنیادی اصولوں کی طرف توجہ دلاتے ہیں جو جنوری ۱۹۵۱ء میں ہر مکتبِ خیال کے علماء نے بالاتفاق مرتب کیے تھے۔ ان کی ایک کاپی ہمارے اس جواب کے ساتھ منسلک کی جا رہی ہے۔ اس سے کمیشن کو معلوم ہو جائیگا کہ انصاف، مساوات اور رواداری کے اسلامی اصول فی الحقیقت کیا ہیں اور ان پر ایک جمہوریت کیسے قائم ہو سکتی ہے جو ہر دور میں چل سکتی ہو۔

سوال نمبر ۴۰

۴۰- کیا آپ ہمارے دائرۂ کار کو ملحوظ رکھتے ہوئے کوئی اور تجویز پیش کرنا چاہتے ہیں ؟

جواب :- ہم حسبِ ذیل تجاویز پیش کرتے ہیں :

۱- گذشتہ سال جسٹس ایس اے رحمٰن کی صدارت میں جو لا کمیشن مقرر کیا گیا تھا اس کی رپورٹ کا صفحہ ۵ خاص طور پر لائقِ توجہ ہے۔ اس مملکت کے باشندوں کی عظیم اکثریت اسلامی قانون چاہتی ہے اس لیے دستور میں صرف یہ امر کافی نہیں ہے کہ قرآن اور سنت کے خلاف کوئی قانون نہ بنایا جائیگا، بلکہ ایجابی طور

(باقی آخری صفحہ پر)